اسلامی طلاق

— اس کے فائدے اور طریقہ —

از شیخ ابوزہرہ استاذ قانون اسلامی قاہرہ یونیورسٹی مصر

(محترم مقالہ نگار شیخ ابوزہرہ، مصر کے نہایت ممتاز اور جری عالم ہیں۔ قاہرہ یونیورسٹی مصر میں اسلامی قانون کے استاذ ہیں۔ موصوف اسلامی قانون کا نہایت گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کی متعدد تصانیف اہلِ علم و دانش حلقے سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ بالخصوص ائمۂ اسلام پر اُن کا عظیم الشان مجموعہ اس دور کا بے نظیر تحفہ ہے۔ شیخ موصوف نے اس مجموعہ میں جو امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابن تیمیہ، امام ابن حزم، امام زید، امام جعفر صادق (اور امام شاہ ولی اللہ) زیر طباعت ہے) پر مشتمل ہے نہ صرف ائمۂ اسلام کی شخصیت اور ان کے فقہی نظریات کو بیان کیا ہے بلکہ اسلامی قانون کے ان تمام مکاتبِ فکر کی پوری تاریخ اور اس کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لیا ہے۔ اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی قانون ایک جامد قانون نہیں ہے بلکہ ایک زندۂ جاوید اور بشری ضروریات کو ہر دور میں پورا کرنے والا پاکیزہ قانون ہے۔ موصوف لاہور کے بین الاقوامی اسلامی مذاکرے میں بھی شریک ہوتے تھے۔ مصر میں پچھلے دنوں شام و مصر کے قوانین کو یکساں کرنے کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اُس کے ایک ممبر آپ بھی تھے۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹ مرتب کی ہے اُس کی جملہ تفصیلات تو ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئیں۔ البتہ طلاق و نکاح اور بیت الطاعۃ کے بارے میں اس رپورٹ کے کچھ اجزاء اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ زیر نظر مقالہ جو صرف طلاق کی بحث پر مشتمل ہے

ہم نے کویت کے ماہوار رسالہ "العربی" سے لیا ہے۔ موصوف نے اس مقالہ میں اسلامی طلاق کے تمام پہلوؤں کو مخالفین کے اعتراضات کی روشنی میں واضح کیا ہے اور پوری جرأت کے ساتھ یہ بتا دیا ہے کہ اسلام کے عائلی قانون میں تبدیلی کا مطالبہ کرنے والا عنصر دراصل یہ آرزو رکھتا ہے کہ خاندان کا اسلامی ڈھانچہ ختم کر کے وہاں غیر اسلامی ڈھانچہ نصب کیا جائے"۔ ــــــ خ ۔ ح]

اسلام میں طلاق کا تصور لفظ طلاق بذات خود ایک نہایت ناگوار اور مبغوض لفظ ہے جس اس اور باشعور انسان کے ذہن میں آتے ہی یہ لفظ جسم پر ایک تھرتھراہٹ طاری کر دیتا ہے اور نفرت و کراہت کے جذبات سے لبریز کر دیتا ہے۔ شریعت اسلامی بھی اس لفظ کو کراہت اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "ما احل اللہ شیئًا ابغض الیہ من الطلاق" (اللہ تعالیٰ نے طلاق کی طرح کسی اور ناپسندیدہ چیز کو حلال نہیں ٹھہرایا) طلاق کے بارے میں شریعت کا یہ نقطۂ نظر اس لیے ہے کہ یہ اُس ربط و تعلق پر تیشہ چلانے والی ہے جو سنّت اللہ کے مطابق قائم کیا گیا ہے۔ اور فقہاء کی زبان میں یہ نعمتِ زوجیت کو زائل کرنے والی ہے۔

طلاق کا اختیار کسے ہونا چاہیے ازدواجی رشتہ جب نعمت کے بجائے نفرت و بغض کی صورت اختیار کرے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے طلاق کا راستہ اختیار کر لینے کا فیصلہ کر لیا جائے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار کس کو ہونا چاہیے ...

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ جب میاں بیوی دونوں قطع تعلق پر متفق ہو جائیں تو ان کا یہ اتفاق اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ازدواجی زندگی کا چشمۂ صافی انتہائی مکدر ہو چکا ہے اور اب ایک مُصلح زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ زوجین کو مزید غور و فکر کی دعوت دے، اس اندیشہ کی بنا پر کہ شاید دونوں فریقوں میں سے کوئی طیش و غضب میں آکر یہ اقدام

کر رہا ہو۔ لیکن اگر عقدِ نکاح کو کھول دینے پر دونوں کا اتفاق نہ ہو، بلکہ یک طرفہ خواہش پائی جاتی ہو، تو اب یہ امر قابلِ بحث ہے کہ پھر طلاق کا اختیار کسے ہونا چاہیے، مرد کو یا عورت کو یا عدالت کو؟

طلاق کا اختیار عدالت کو دینے والوں کے دلائل اور ان کا جواب

بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ جب طلاق کے معاملے میں دونوں فریق (میاں اور بیوی) متفقہ طور پر خواہشمند نہ ہوں تو مثالی طریقہ یہ ہے کہ طلاق کا معاملہ حاکمِ عدالت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اور میاں اور بیوی میں سے کسی کو انفرادی اختیار نہ ہونا چاہیے۔ اس گروہ کے دلائل یہ ہیں کہ اولاً عدالت ایک غیر جانبدار ادارہ ہے، ثانیاً جس معاہدے کی رُو سے معاہدہ کے دونوں فریقوں پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہوں اُس معاہدہ کو یک طرفہ خواہش باطل نہیں کر سکتی، ثالثاً اگر طلاق کا اختیار زوجین میں سے صرف ایک فرد کے اختیار میں دے دیا جائے تو غیظ و غضب کا کوئی بھی دورہ رشتۂ ازدواج پر تیشہ چلا سکتا ہے اور اگر بعد میں ندامت کا احساس ہو بھی جائے تو یہ احساس بعد از وقت ہو گا۔

یہ رائے کسی حد تک قابلِ غور تو ہے لیکن اسے اس وقت تک صائب نہیں کہا جا سکتا جب تک انسان کے باطنی اسرار اور قلبی واردات کو کسی ظاہری دلیل سے ثابت کرنے کا انتظام نہ کر لیا جائے۔ ظاہری دلیل کی شرط اس بنا پر لگائی گئی ہے کہ عدالت اپنا فیصلہ صرف ان بنیادوں پر صادر کر سکتی ہے جو اُسے واضح اور محسوس شہادتوں کے ذریعہ فراہم ہوئی ہوں، نیز عدالت کا کام ہمیشہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ حق کیا ہے اور ظلم کیا ہے تاکہ وہ حق کا استقرار اور ظلم کا انسداد کر سکے لیکن ازدواجی فساد کا قضیہ ظالم اور مظلوم کا سا قضیہ نہیں ہے (کہ ظالم کو ظلم سے روکا جائے اور مظلوم کو اس کا حق دلوایا جائے)، بلکہ یہاں اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا اب ازدواجی رابطہ میں بقا اور دوام کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے۔ مثلاً اگر خاوند عدالت کے پاس طلاق کا مطالبہ لے کر جاتا ہے اور مطالبۂ طلاق کی بنیاد یہ ہے کہ وہ بیوی کے رویّہ سے بیزار

ہو چکا ہے اور اصلاح کی تمام کوششیں صدا بصحرا ثابت ہوئی ہیں۔ تو کیا حاکم عدالت طلاق صادر کریگا یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ حاکم عدالت مزید اصلاح و اتحاد پر زور دے گا لیکن اگر وہ بھی اپنی سعی میں ناکام ہو گیا تو صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتے گا اور وہ ہے طلاق کا راستہ۔ اب غور کیجیے کہ خواہ خاوند (مایوس ہو کر) خود ہی ابتداءً بیوی کو طلاق دے یا حاکم عدالت (ناکام ہو کر) تفریق کرے، نتیجہ کے لحاظ سے دونوں صورتوں میں فرق کیا واقع ہوا؟ اس کے سوا اور کیا فرق نظر آتا ہے کہ عدالت نے خاوند کو عجلت کے بجائے تحمل و تدبر پر اکسایا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ طلاق کے معاملہ میں عجلت اور جلد بازی کے بجائے صبر و تحمل اور انتظار کا انتظام تو خود شریعت اسلامی کے نظامِ طلاق میں بصورت احسن واتم موجود ہے۔

طلاق کا حق مرد کو کیوں حاصل ہے شریعت نے طلاق (یعنی حقوقِ زوجیت سے دستبردار ہو جانے) کا اختیار اصالۃً مرد ہی کو دیا ہے کیونکہ مرد کئی مالی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مثلاً ازدواجی تعلق کی ابتدا میں تمام مالی بار کو اٹھانے والا مرد ہی ہے اور طلاق دینے کی صورت میں بھی مزید مالی بوجھ اُس کے کندھوں پر آ کر پڑے گا، مثلاً بچوں کا مخصوص نفقہ اُسے ادا کرنا ہوگا، رضاعت اور حضانت (پرورش) کی اُجرت اُس کے ذمہ ہوگی یہ اُن مصارف کے علاوہ ہوں گے جو اُسے آئندہ کسی نئے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتے وقت پیش آئیں گے۔ یہ تمام ذمہ داریاں مرد کو طلاق کا اقدام کرتے وقت بار بار سوچنے اور بار بار اپنے دل سے مشورہ کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں اور اغلب حال میں مرد طلاق کا قطعی فیصلہ اُسی وقت کرتا ہے جب وہ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتا۔

عورت کا حق خُلع یہاں یہ اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ مرد اگر عورت سے بیزار ہو جائے تو شریعت مرد کا لحاظ تو کرتی ہے اور اُسے مخلصی کے لیے راستہ دکھا دیتی ہے لیکن عورت اگر مرد سے بیزار ہو جاتے تو شریعت نے عورت کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ عورت بعض اوقات اپنے خاوند سے سخت متنفر ہو جاتی ہے یہاں تک کہ مرد کے ساتھ وابستہ رہنے کے لیے اپنے

دل میں ادنیٰ سے ادنیٰ کشش بھی نہیں پاتی اور ازدواجی زندگی اُس کے لیے آفت بن جاتی ہے لیکن چونکہ اُس کی نجات کا کوئی راستہ نہیں ہوتا اس لیے وہ مرد کا بستہ فتراک بن کر ٹکی رہتی ہے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ شریعت نے عورت کا بھی پورا پورا لحاظ کیا ہے اور عورت کو خلع کا حق دے کر اس خرابی کا علاج کر دیا ہے۔ خلع کی صورت یہ ہوتی ہے کہ عورت اپنا مہر جو مرد نے اُسے ازدواجی تعلق کا آغاز کرتے ہوئے دیا تھا، مرد کو پیش کر کے علیحدگی کا مطالبہ کرے۔ عورت کا یہ حق قرآن کی آیتِ ذیل سے ثابت ہے: ولا یحل لکم ان تاخذوا مما اٰتیتموھن شیئاً الا ان یخافا الّا یقیما حدود اللہ، فان خفتم الا یقیما حدود اللہ فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ، تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا۔ تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو۔ اس میں سے کچھ بھی واپس لو۔ الّا یہ کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے، تو ایسی صورت میں جبکہ تم کو خوف ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو کچھ مضائقہ نہیں اگر عورت کچھ معاوضہ دے کر عقدِ نکاح سے آزادی حاصل کرے۔

خُلع کے باب میں امام مالک کا مسلک | امام مالک رضی اللہ عنہ کا خیال ہے کہ بعض اوقات عورت خاوند سے کراہت و نفرت کرتی ہے اور اُس سے گلو خلاصی کرانا چاہتی ہے مگر خاوند اصل مہر کے معاوضہ میں اُسے طلاق دینے کے لیے راضی نہیں ہوتا، اور اُسے تنگ کرنے لگتا ہے تاکہ طلاق کا معاوضہ اصل مہر سے زیادہ وصول کرے، یا محض اُسے ستانے کے لیے سخت گیری شروع کر دیتا ہے لہٰذا امام مالکؒ قاضی شرع کو اختیار دیتے ہیں کہ اگر عورت طلاق کی خواہشمند ہو تو مرد نہ بھی چاہتا ہو تو وہ مرد کی خواہش کے علی الرغم تحکیم حکمین کے بعد خلع نافذ کر دے اور اگر نفرت و افتراق کا اظہار عورت کی جانب سے ہو مگر مرد کی طرف سے کسی ظلم و زیادتی کا اظہار نہ ہوا ہو تو ایسی صورت میں قاضی تفریق صادر کر دے اور عورت پر لازم کر دے کہ وہ یا تو پورا مہر یا اُس کا کچھ حصہ مرد کو واپس لوٹائے۔

جون ۱۹۵۶ء میں مصر میں شخصی قوانین کا جو نظام تجویز کیا گیا تھا اُس میں امام مالک رحمہ اللہ کے مذکورہ بالا مسلک کو معمول بہ بنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ آج کل شام و مصر کے قوانین کو یکساں کرنے کے لیے جو خاکہ مرتب کیا گیا ہے، اُس میں بھی اس تجویز کو شامل کر لیا گیا ہے۔

قضیۂ طلاق کو عدالتی تحقیقات کا ہدف نہ بنانے کی وجوہ طلاق خواہ شوہر دے یا بیوی کے مطالبہ پر عدالت اُس سے دلوائے، یہ فعل اشد ضرورت کے بغیر مباح نہیں ہے۔ لیکن یہ "اشد ضرورت" جو طلاق کو بالآخر مُباح ٹھہراتی ہے، کوئی محسوس اور ٹھوس چیز نہیں ہے جس کا عدالت کے سامنے ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہو۔ بلکہ یہ ضرورت بسا اوقات ایک "باطنی امر" ہو سکتی ہے جیسے دلی نفرت و بیزاری۔ بعض اوقات بلاشبہ وجوہِ بیزاری قابلِ ثبوت و شہادت ہو سکتے ہیں مگر زوجین کی مصلحت اور خاص طور پر عورت کی مصلحت اُن کے اظہار و اعلان کی اجازت نہیں دیتی اور اغلب حال میں تو سوسائٹی کے مصالح کا تقاضا بھی یہ ہوتا ہے کہ تفریقِ زوجین کے اسباب کا بھانڈا چوراہے میں نہ پھوڑا جائے۔

چنانچہ بعض مصری عدالتوں نے یہ طے کر کے سخت غلطی کی ہے کہ یا تو قاضی کے نزدیک شوہر کی ضرورتِ طلاق کے وجوہ ثابت ہو جائیں ورنہ عدالت مرد کے خلاف طلاق کا معاوضہ (جو مہر کے علاوہ ہو گا) ادا کرنے کا فیصلہ صادر کر دے گی۔ اس غلطی کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ طلاق کی بنا ایسے اسباب بھی ہو سکتے ہیں جنہیں شہادتوں کے ذریعہ سے ثابت نہ کیا جا سکتا ہو یا ثبوت فراہم ہو سکتا ہو مگر قاضی کے سامنے اُن کا افشا درست اور گوارا نہ ہو۔ دراصل خانگی معاملات بڑے نازک اور دقیق ہوتے ہیں۔ شوہر اور بیوی کے باہمی حالات کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ نہ گواہوں کے علم میں آسکتے ہیں۔ کمرۂ عدالت میں انہیں زیرِ بحث لانا نہ صرف رازہائے درونِ پردہ کا غیر مناسب افشا ہے بلکہ خاندان کے تقدس پر اس سے حرف آتا ہے۔ اسی لیے شریعت نے خانگی مسائل کو زیادہ تر ہر شخص کے دین و ایمان پر چھوڑا ہے۔ اور

اللہ تعالیٰ کا محاسبہ یاد دلایا ہے جس کی نگاہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی حقیقت کی روشنی میں فقہائے اسلام نے طلاق کے مسئلے کو نری قانونیت کے بل پر نہیں بلکہ دین و تقویٰ کی اخلاقی بنیادوں پر حل کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

غصہ کی حالت میں دی جانے والی طلاق یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ مرد بعض اوقات بے قابو ہو کر طلاق دے ڈالتا ہے اور طیش و غضب کے ایک ہی دورے سے پورے خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ یا وہ اعصابی اضطراب سے مغلوب ہو کر یہ اقدام کر دیتا ہے مگر جب وہ سکون کی حالت میں آتا ہے اور اُس کے ہوش ٹھکانے ہوتے ہیں تو کفِ افسوس ملنے لگتا ہے۔ کیونکہ اُس سے جو حرکت سرزد ہو چکی ہے اُس کا کوئی پیشگی منصوبہ یا عزم اُس نے نہیں کیا تھا۔ اب اگر قانونِ فوجداری کی رُو سے قاتل کو سزائے موت دینے کے لیے یہ شرط ہے کہ اقدامِ قتل سے پہلے قتل کا ارادہ و منصوبہ پایا جانا ضروری ہے تو ایک خاندان کو بھی ایسی صورت میں ہلاک و تباہ کرنا درست نہیں ہو گا جب کہ ثابت ہو جائے کہ اس کی تباہی و ہلاکت کا پہلے سے کوئی منصوبہ و ارادہ نہیں تھا اور نہ ایسے کسی ارادہ و منصوبہ کو نافذ کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

طلاق کا مسنون طریقہ اس پُرزور استدلال کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے طلاق دینے کا جو طریقہ مقرر کیا ہے اُس میں ان خدشات کا مکمل تدارک کیا گیا ہے۔ مثلاً اسلام نے پہلی ہدایت یہ دی کہ طلاق مسنون طریقہ کے مطابق دینی چاہیے۔ مسنون طریقہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ہی رجعی طلاق دی جائے۔ طلاقِ رجعی میں یہ موقع باقی رہتا ہے کہ مرد اگر چاہے تو دورانِ عدت نئے نکاح اور نئے مہر کے بغیر ہی بیوی کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ زمانۂ حیض میں طلاق نہ دی جائے۔ کیونکہ عورت ان ایام میں اعصابی اضطراب میں مبتلا ہوتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ مرد و عورت کی باہمی چپقلش اسی اعصابی عارضہ کا نتیجہ ہو۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس واقعے کو عرض کیا ۔ آپ سُن کر ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اسے حکم دے دو کہ رجوع کرے کیونکہ یہ طلاق طریقۂ سنت کے خلاف تھی ۔ طلاق کی قیود میں سے یہ بھی ہے کہ طلاق اُس طُہر میں نہ دی جائے جس میں مرد عورت سے خلوت کر چکا ہو یہ ایک سراسر غیر معقول بات ہے کہ جب مرد عورت سے اس حد تک بیزار ہو چکا ہو کہ اُس کے دل میں خوش اسلوبی سے بیوی کے ساتھ نباہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی ہو تو پہلے اُس سے خلوت کرے اور پھر طلاق دے دے ۔

یہ ہے طلاق کا مسنون طریقہ ۔ جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ قیود و شرائط کے مطابق طلاق دیتا ہے تو یہ اس امر کی واضح علامت ہے کہ اس شخص کے دل میں اب بیوی سے حسن معاشرت کی قطعاً گنجائش باقی نہیں رہی ہے ۔ اس کی بیزاری اعصابی اضطراب کے تحت نہیں ہے بلکہ پورے تدبر و تحمل پر مبنی ہے ۔ بایں ہمہ شارع کریمؐ نے اس کے لیے عدت کے دوران رجوع کر لینے کا آخری موقع بھی باقی رکھا ہے ۔ عدّت کا زمانہ اکثر فقہاء کے نزدیک تین حیض ہیں جو بالعموم تین ماہ کو محیط ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ایک سال یا ایک سال سے زیادہ عرصہ تک ممتد ہو جاتے ہیں ۔ اگر عدت کا زمانہ گزر جائے اور مرد مراجعت کا موقع ملنے کے باوجود رجوع نہ کرے تو یہ کمالِ نفرت کی علامت ہے ۔ شارع کریمؐ نے اس کے باوجود فریقین کو اجازت دی ہے کہ اگر تیسری طلاق نہ دی گئی ہو ، تو وہ دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں اور اپنے ازدواجی ربط کو بحال کر سکتے ہیں ۔

بہر حال شریعت نے مرد کو تین طلاقوں کا حق دیا ہے ۔ اگر پہلی اور دوسری طلاق کے بعد زوجین نے رجوع کر لیا اور پھر کسی وقت مرد نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب مرد کے لیے رجوع کا اور دوبارہ نکاح کرنے کا کوئی حق نہ رہا ۔ اب اگر وہ سابقہ بیوی کو عقدِ نکاح میں لا سکتا ہے تو عورت کی تحلیل کے بعد لا سکتا ہے ۔ تحلیل کی مشروع صورت یہ ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے سے نکاح کرے ، اور وہ شخص اُس سے ازدواجی تعلق قائم کرے اور پھر دونوں کا رشتۂ زوجیت موت

کی وجہ سے یا ذاتی اسباب کے تحت طلاق واقع ہو جانے کی وجہ سے منقطع ہو تب وہ عورت اپنے سابق خاوند کے لیے حلال ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ ہے علی منہاج السنۃ طلاق دینے کی صورت، جس میں ایک وقت میں اور ایک طہر کے اندر ایک طلاق دی جاتی ہے۔

طلاق بدعی کا حکم اب سوال یہ ہے کہ طریقۂ سنت کے برخلاف جو طلاق دی جائے گی وہ واقع ہو گی یا نہیں۔ امامیہ (یعنی اثنا عشریہ)، اکثر زیدیہ اور امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک وہی طلاق واقع ہو گی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ طریقہ اور حدود و قیود کے ساتھ دی جائے گی۔ ائمۂ اربعہ کے نزدیک طلاق بدعی (منہاج السنت کے خلاف دی ہوئی طلاق) بھی واقع ہو جاتی ہے لیکن ایسی طلاق دینے والا اللہ کے نزدیک سخت مجرم اور گنہگار ہے (ومن یکسب اثما فانما یکسبہ علی نفسہ)

قانونِ طلاق کی سابقہ ترمیمات مصر ۱۹۲۹ء تک طلاق کے مسئلہ میں مذہب حنفی کا پیرو رہا ہے لیکن ۱۹۲۹ء میں اس میں تبدیلی واقع ہوئی اور شخصی قوانین کی دفعہ ۲۵ کی رو سے اس مسئلہ میں ائمۂ اربعہ کے مذاہب اور امام ابن تیمیہؒ کے مختار اقوال میں سے اُن اقوال و آراء کو اختیار کر لیا گیا جن سے وقوع طلاق کی تیزی کافی حد تک نرم ہو گئی۔ علاوہ ازیں یہ بھی طے کیا گیا کہ نوعیت ذیل کی طلاقوں کے علاوہ ہر طلاق رجعی سمجھی جائے گی:

(۱) وہ طلاق جو خلوتِ صحیحہ سے قبل دی گئی ہو (۲) وہ طلاق جو عورت مالی معاوضہ دے کر حاصل کرے (۳) تیسری تکمیلی طلاق جو پہلی اور دوسری طلاقوں کے بعد تیسرا حیض گزرنے پر دی جائے۔ (۴) وہ طلاق جسے قانون طلاقِ بائن قرار دے۔ قانون میں یہ توضیح بھی کر دی گئی کہ جبر و اکراہ کے تحت یا بے ہوشی کی حالت میں جو طلاق دی جائے گی وہ واقع نہیں ہو گی۔ اسی طرح طلاق معلق بھی واقع نہیں ہو گی۔ طلاق معلق سے مراد طلاق کی وہ صورت ہے جس میں اصلاً طلاق دینے کا قصد نہ کیا گیا ہو بلکہ عورت کو کسی کام سے باز رکھنے یا کسی کام پر آمادہ کرنے کی خاطر یا اپنی بات کو پختہ اور وزن دار بنانے کے ارادے سے طلاق کا لفظ بولا گیا ہو۔ یہ احکام ابن تیمیہ کے مختار

اقوال و فتاویٰ سے ماخوذ ہیں اور ابن تیمیہ کا ماخذ فقہائے امامیہ ہیں۔

طلاق رجعی اور طلاق بائن کا فرق | یہاں طلاق رجعی اور طلاق بائن کا فرق واضح کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ طلاق رجعی میں ازدواجی رشتہ فی الفور منقطع نہیں ہو جاتا بلکہ عدت ختم ہونے کے بعد منقطع ہوتا ہے۔ چنانچہ عدت کے دوران شوہر اور بیوی میں سے کوئی ایک مر جائے تو وہ ایک دوسرے کے ترکہ میں سے حصہ پائیں گے۔ اسی طرح طلاق رجعی میں مرد عقدِ جدید اور مہر جدید کے بغیر ہی، صرف "میں نے رجوع کر لیا" کے الفاظ کہہ دینے سے اپنے رشتۂ زوجیت کو بحال کر سکتا ہے لیکن بہر حال طلاق رجعی تین طلاقوں میں سے ایک طلاق محسوب ہو گی۔ اس کے برعکس طلاق بائن احکام عدت کے ماسوا رشتۂ زوجیت کے ہر اثر کو فی الفور ختم کر دیتی ہے۔ اگر طلاقِ بائن کے بعد فریقین میں سے کوئی ایک اثنائے عدت یا بعد عدت مر جائے تو وہ ایک دوسرے کے ترکہ کے وارث نہیں ہوں گے۔

طلاق بائن کی قسمیں | طلاق بائن کی بھی دو قسمیں ہیں: بائن اصغر اور بائن اکبر۔ بائن اصغر کے لیے بائن غیر مغلظہ اور بائن اکبر کے لیے بائن مغلظہ کی اصطلاح بھی مستعمل ہے۔ بائن اکبر وہ طلاق ہوتی ہے جو پہلی اور دوسری مسنون طلاقوں کے بعد تیسری تکمیلی طلاق دی جائے۔ بائن اکبر میں عورت اپنے سابقہ شوہر کے لیے صرف اسی وقت حلال ہو سکتی ہے جب مشروع طریقہ کے مطابق اس کی تحلیل ہو جائے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ بائن اصغر وہ طلاق ہوتی ہے جو تیسری تکمیلی طلاق نہ ہو۔ اسی طرح خلوتِ صحیحہ سے قبل دی جانے والی طلاق یا وہ طلاق جو عورت مال کے عوض مرد سے حاصل کرتی ہے، بھی بائن اصغر ہو گی جس میں عورت اپنے سابق شوہر کے لیے نئے مہر اور نئے عقد کے ساتھ حلال ہو جائے گی۔

اسلام کے عائلی قوانین پر مغربی حملوں کا آغاز | اسلامی ممالک میں جملہ عائلی احکام اسلامی طریقہ پر جاری و ساری تھے، جو کتاب اللہ، سنتِ رسول، آثارِ صحابہ اور اقوالِ فقہاء و مجتہدین سے ماخوذ تھا۔ مسلمان ائمہ و فقہاء نے عائلی احکام کی جو حدود و قیود شریعتِ اسلامی کے مطابق مقرر کی

ہوئی تھیں ملتِ اسلامیہ ان کی پوری پابندی کر رہی تھی اور کبھی ان سے بیزار اور دل گرفتہ نہیں ہوئی تھی۔ مگر ماضی قریب میں یکایک مغربی مصنفین کی طرف سے اسلام کے عائلی قوانین پر تنقید و استہزاء کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اور انہوں نے یہ خیال پھیلانا شروع کر دیا کہ مسلمان عورت انتہائی مظلوم ہے اور اس کے تمام حقوق سلب کر لیے گئے ہیں۔ حالانکہ شریعت اسلامی نے عورت کو اپنی ذات اور اپنے مال و متاع پر مکمل اختیار دیا ہے اور اس کے مقابلے میں مغربی عورت کو آج تک یہ اختیارات نصیب نہیں ہو سکے۔ لیکن اہلِ مغرب کی یہ عیاری تھی کہ انہوں نے ان پہلوؤں کو تو نظر انداز کر دیا اور طلاق کے مسئلہ کو ہدفِ طعن بنا لیا اور مختلف پیرایوں سے اس شرعی مسئلہ پر اپنے زہریلے تیر برسانے شروع کر دیئے۔ اور مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی ان کا ہمنوا بن گیا۔

مصری متجددین موجودہ صدی کے اوائل میں مصر میں مرحوم قاسم امین اٹھے۔ انہوں نے اپنی دونوں کتابوں "عورت کی آزادی" اور "جدید عورت" میں طلاقِ شرعی پر اہلِ مغرب کی تقلید میں سخت حملے کیے اور طلاق کو محدود اور مقید کر دینے کا مطالبہ اٹھایا۔ بلکہ اس سلسلہ میں نئے احکام و مسائل بھی وضع کر لیے اور دعویٰ یہ کیا کہ یہ احکام فقہاء کے اقوال سے ماخوذ ہیں یا ان کی تخریج فقہاء کے اقوال پر کی گئی ہے۔ اس وقت ہمیں اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ مرحوم کی تخریجات و آراء کی حقیقت کیا ہے لیکن یہ بات بالکل عیاں ہے کہ آج کل عرب ممالک میں "تجدید و اصلاح" کے جتنے داعی پائے جاتے ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے کوئی ایسی انوکھی یا طبعزاد تجویز پیش کی ہو، جو قاسم امین نہ کر چکا ہو۔ بلکہ یہ سب حضرات اُسی کی مکھی پر مکھی مار رہے ہیں۔

کیا طلاق کا رجحان بڑھ رہا ہے اس وقت اصل سوال ہمارے سامنے یہ ہے کہ چونکہ اب طلاق کا استعمال غلط ہو رہا ہے تو کیا گھروں اور خاندانوں کی بربادی کی تمام تر ذمہ داری طلاق کے اوپر ڈالی جاتی ہے؟ ـــ یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ اس بربادی کے واقعات مصری شہروں

میں تو بکثرت سامنے آرہے ہیں مگر دیہاتی آبادی اس مصیبت سے محفوظ ہے۔۔
اس مسئلہ پر ہم اعداد و شمار کی زبان میں روشنی ڈالیں گے۔ کیونکہ دَورِ حاضر کی ذہنیت کے لیے اس سے بڑھ کر بلیغ کوئی انداز نہیں ہے۔

اب سنیے، ۱۹۵۰ء میں مصر میں طلاقوں اور شادیوں کا تناسب تقریباً ۳۰ فیصد تھا۔ اس کے بعد یہ تناسب گرنا شروع ہوا حتیٰ کہ ۲۸ فیصد تک پہنچ گیا اور بالآخر ۱۹۵۵ء میں ۲۳½ پر تک آگیا۔ کیونکہ اس سال شادیوں کی تعداد ۲ لاکھ ۷ ہزار تھی جب کہ طلاقوں کی تعداد ۶۳ ہزار تھی۔ یہ تخمینہ ہم نے شماریات کی اس کمیٹی سے لیا ہے جو وزارتِ معاشرتی بہبود اور وزارتِ تعلیم نے مل کر شماریاتی مہم کے لیے تشکیل دی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ نکاح و طلاق کا تناسب شرعی قانون کی عملداری میں ہی، از خود نیچے اُتر رہا ہے اور اس کے منجملہ اسباب میں سے عوام کی بیداری اور شعور کی پختگی، شادی کے غیر معمولی مصارف اور معیارِ زندگی کا ارتفاع ہے۔

طلاق اور اس کے مبیّنہ نقصانات کا حقیقت پسندانہ جائزہ معاشرتی علوم کے ماہرین کو یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ہر طلاق زوجین کے درمیان قطعِ تعلق کا موجب نہیں ہوتی اور نہ ہر طلاق خاندانی بربادی کا سبب ہوتی ہے اور نہ ہر طلاق ضیاعِ اولاد کا پیغام لے کر آتی ہے۔ یہ بات ہم کسی جذباتی رَو میں نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی دلائل کے ساتھ توضیح کیے دیتے ہیں۔

ہمارا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ ہر طلاق زوجین کے قطعِ تعلق پر منتج نہیں ہوتی۔ چنانچہ مباحثِ گذشتہ سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ طلاق کی دو قسمیں ہیں: طلاقِ رجعی اور طلاقِ بائن اور بائن کی بھی دو قسمیں ہیں بائن اکبر اور بائن اصغر۔ طلاقِ رجعی کے بارے میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ محض زبان سے نکال دینے اور قاضی کے پاس اس کی توثیق کر دینے سے رشتۂ مناکحت کو نہیں کاٹ دیتی۔ اس میں مرد رجوع کر سکتا ہے۔ چنانچہ اسے موجبِ انقطاع کے بجائے

انقطاع کا الٹی میٹم کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا طلاقوں کی جو تعداد آپ گنوائیں اُس میں سے رجعی طلاقوں کو حذف کر دیں۔ اس سے ہم با سانی معلوم کر سکیں گے کہ کس طلاق نے فی الواقع تفریق پیدا کی اور کونسی لازم بجلانے پر ختم ہو گئی۔ اسی طرح طلاق بائن (یعنی بائن اصغر) میں دوبارہ نکاح کیا جا سکتا ہے اور کٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا جا سکتا ہے۔ لہٰذا قطعی اور دائمی انقطاع کی صورت یہاں بھی معدوم ہے۔ بنابریں لازم ہے کہ ان شادیوں کو بھی کم کر دیا جائے جو طلاق کے بعد دوبارہ نکاح دہر کے ساتھ منعقد ہوئیں۔

ہمارا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ ہر تفریق لازماً خاندانی بربادی کو جنم نہیں دیتی۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ خلوتِ صحیحہ سے قبل جو طلاق دی جاتی ہے اُس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ طلاق سے بڑھ کر دراصل ایک ایسے خطرے کا تدارک ہوتا ہے جو غیر صحت مندانہ انتخاب وازدواج کی بنیاد پر بنئے خاندان کی تشکیل کی صورت میں ہو سکتا تھا۔ پس اس طلاق نے دراصل خاندان کو مسمار نہیں کیا کیونکہ خاندان تو ابھی وجود پذیر نہیں ہوا، بلکہ اس نے خاندان کی چہار دیواری کو غیر مستحکم اور نادرست بنیادوں پر استوار ہونے سے بچا لیا۔

ہمارا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ اغلب حال میں طلاق ضیاعِ اولاد کا پیغام لے کر نہیں آتی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ طلاق کے راستہ کا سب سے بڑا پتھر خود اولاد ہے۔ چنانچہ ۴۱-۱۹۴۰ء کے طلاق کے اعداد و شمار سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ان سالوں میں جو طلاقیں ہوتی ہیں اُن میں سے ۷۵ فیصد سے زیادہ وہ طلاقیں ہیں، جو اولاد سے پہلے واقع ہوتی ہیں، ۱۷ فیصد طلاق صرف ایک بچے کے پیدا ہونے کے بعد ہوئیں۔ اسی طرح جوں جوں بچوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے طلاق کا تناسب گھٹتا جاتا ہے حتیٰ کہ جب پانچ بچوں تک معاملہ پہنچتا ہے تو طلاق کا تناسب ۱٫۵ رہ جاتا ہے۔ یہ اعداد و شمار کی زبان اس امر کا واضح ثبوت دے رہی ہے کہ طلاق کا ضیاعِ اولاد سے کوئی تعلق نہیں ہے بچے طلاق کے معاملے میں مرد کے لیے بڑی بھاری زنجیر ہوتے ہیں بلکہ کوئی دوسری زنجیر خواہ کتنی ہی مضبوط ہو بچوں سے بڑھ کر طلاق کا انسداد نہیں کر سکتی۔ یہ فطرت کا قانون ہے، جیسے

(باقی صفحہ ۶۲ پر)